الست

منیر سیفی

اَلَست

منیر سیفی

کاغذی پیرہن

الستِ ...... غزلیں ...... منیر سیفی

وسیم جگنو نے مکتبۂ جدید پریس' لاہور' سے چھپوا کر
کاغذی پیرہن' ۷۲' بیڈن روڈ' لاہور' سے شائع کی

اشاعتِ اوّل : اکتوبر ۲۰۰۴ء
مشینی خطاطی : ورڈ میکرز
سرورق : موجد
قیمت : ۱۵۰ روپے

Alest
(*Urdu* Poetry by *Munir Saifee*)

Copyright © 2004 - 1st Edition

Printed by:
Maktaba-e-Jadeed Press
14 Empress Road, Lahore, Pakistan.

Price:
In Pakistan: Rs. 150.00
Abroad: US$. 10.00 or Euro. 8.00 or UK Pound. 6.00

Published by:
Kaghadhi Paerahen
72, Beadon Road, Lahore, Pakistan.
Tel: +92.42.7122552
Email: kaghadhipaerahen@hotmail.com

کاغذی پیرہن
KAGHADHI PAERAHEN

ISBN 969-8527-52-4

سب تتلیوں، سارے جگنوؤں

رجا، ردا

حماد، مصطفیٰ

بلال، حمزہ

کے نام......

اپنے ہاتھوں پہ بھی نہ بیعت کی
اِتنا بھی سِلسِلہؒ نہِ تھا مِیرا

اَذکار

پیش لفظ

منیر سیفی اَور اَلست...... خالد اقبال یاسر ۱۱

عقیدت

حمد ر چھت ہے دیوار و در ہے ۱۷
نعت ر آپؐ کی نسبت سے ہُوں ۲۱
نعت ر تری تحریک سرمدٗ تیرے دستورِ مخلّد کا ۲۳
نعت ر یہ کس روشن اَدا کی روشنی ہے! ۲۵
نعت ر زمیں سے آسماں تک اَور کیا اِس کے سوا دیکھا ۲۷
منقبت دَر مدح حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ ۲۹
منقبت دَر مدح حضرت داتا گنج بخشؒ ۳۱

غزلیں

ایک تماشا اَور دِکھایا جا سکتا تھا ۳۷
جب طوفاں کے بیچ کنارہ ہو سکتا تھا ۳۹
وُہ مزاج آشنا نہ تھا میرا ۴۲
ہَوا کے ساتھ سفر اِختیار کرنا تھا ۴۵
وُہ جب رونا بھُول گیا تھا ۴۷
نہیں تھا جو نظر آتا بہت تھا ۴۹
یہ بوجھ سَر سے اُتار لیتا ٗ یہی بہت تھا ۵۱
کلی میں خوشبو اُتر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا ۵۳
زمین و آسماں کے بیچ مَیں تھا ۵۵

یہ دِن بھی آئیں گے مجھ پر کبھی گماں میں نہ تھا ۵۷
سانس کو شمشیر ہونا چاہیے تھا ۵۹
دستِ دُعا لگا کبھی حرفِ دُعا لگا ۶۱
ہَوا کا سامنا کرنا پڑے گا ۶۳
بہت کم کم ہے گو سامان اپنا ۶۵
آئینہ رستہ مِرا تکتا رہا ۶۷
سونے والوں کو کوئی خواب دِکھانے سے رہا ۶۹
اِتنے پُرمغز ہَیں دلائل کیا! ۷۱
ہے نقطوں میں طلسم اے نکتہ چیں کیا! ۷۳
مِرے اِثبات کا ہے فلسفہ کیا؟ ۷۵
دَر تلک ہی تھا دستکوں کا سفر ۷۷
دِل میں درد اُتارا کر! ۷۹
جا کر بھی نہیں جائے مِرے گھر سے نکل کر ۸۱
جب تلک تھی اُڑان سب سے الگ ۸۳
اپنے اَندر گونجا ہُوں ۸۵
زمیں سے آسماں تک کے سفر میں ۸۹
گو جہاں ہُوں وہاں نہیں ہُوں مَیں ۹۱
عکس بھی مَیں ہُوں، چہرہ بھی مَیں، آئینہ بردار بھی مَیں ۹۳
مَیں کہیں، میری ذات اَور کہیں ۹۵
عِشق کی آگ میں جلا ہی نہیں ۹۷
کس منظر میں، کیسے منظر اُگ آتے ہَیں! ۹۹
پھر دریا سے ناتا جوڑا کرتے ہَیں ۱۰۱
درد دیکھیں نہ اب دوا دیکھیں ۱۰۳
خود اپنا ہی تعاقب کر رہے ہو ۱۰۵
جب نہ گنبد نہ صدا رقص میں ہو ۱۰۷
پھُول تھا مَیں نہ ستارہ، پھر بھی ۱۱۰
نڈر بھی ذات میں اپنی ہُوں، خود سے خائف بھی ۱۱۳

فصیلِ گیسو و رُخسار کیا تھی ۱۱۵

جب برسات نکل سکتی تھی ۱۱۷

بڑھاتی رہتی ہے توقیر اُس کی ۱۱۹

ہوا کے ساتھ رہو، راستہ بنا دے گی ۱۲۱

درد کو بے نقاب کیا کرتے ۱۲۳

ہمارے ساتھ دھوکے ہو چکے تھے ۱۲۵

شہر کے آثار پیدا ہو رہے تھے ۱۲۷

مَیں کتنا خوش تھا، مَیں نے کچھ دِیے اُجال رکھے تھے ۱۲۹

دِکھلا کر دریاؤں کی تصویر مجھے ۱۳۱

نفی کے اندر جب اِثبات دِکھائی دے ۱۳۳

یہ کیا کہ عدل صاحبِ ثروت ہی پا سکے ۱۳۵

خواہش کو مہمان کرو گے ۱۳۷

ایسی مشکل میں نہ جاں تھی پہلے ۱۳۹

پس منظر میں منظر سمٹا ہو سکتا ہے ۱۴۱

جب حُسنِ معیار نظر میں ہوتا ہے ۱۴۳

پہلے خود ہی پردوں کو سرکا دیتا ہے ۱۴۵

ہمارے درمیاں رکھّا ہُوا ہے ۱۴۷

رنگ و بُو، علّت و سبب کیا ہے! ۱۴۹

یہ جو صحرا سا کوئی حلقۂ گرداب میں ہے ۱۵۱

ہر گنبدِ بے دَر میں بھی اِک دَر ہے کہ تُو ہے ۱۵۳

آبلہ ہے کہ گھاؤ، جو بھی ہے ۱۵۵

ایک نشہ سا طاری ہے ۱۵۸

کوئی سُورج نہ دِیا یاد آئے ۱۶۱

ایسی بھی صورتِ حالات نہ سمجھی جائے ۱۶۳

نیند کب آئی تھی، در خوابوں کے وا کیسے ہُوئے ۱۶۵

کب تک اَب اَور زحمتِ منظر اُٹھائیے ۱۶۷

خالدِ اقبال یاسر

منیر سیفی اَور اَلست

غالب نے مسائلِ تصوّف کے بیان میں کہہ رکھا ہے کہ بادہ خواری کے سبب اُسے ولی نہ سمجھا گیا۔ منیر سیفی مجھے بادہ نوش نظر نہیں آتا اَور اُس کی شاعری بھی اوّل و آخر صوفیانہ شاعری ہے تو کیا اُسے ولی سمجھا جائے...... اُس کی شاعری کے گہرے مطالعے کے بعد شاید آپ کے دِل میں بھی یہ سوال پیدا ہو! منیر سیفی کی ظاہری وضع قطع اَور ہاتھ میں ہمہ وقت تسبیح سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اُس کی ذات کو اُس کی شاعری سے اَور شاعری کو اُس کی ذات سے الگ کر کے سمجھنا آسان نہیں ہوگا۔

وہ صرف جانتا ہی نہیں، سمجھتا بھی ہے کہ تصوّف برائے شعر گفتن خوب بلکہ بہت خوب ہے مگر اُس نے یہ اِدراک شعوری طَور پر حاصل نہیں کیا اَور نہ اِسے فارمولے کے طَور پر برتتا ہے۔ اُس نے تصوف کی اصل رُوح کو پہچانا ہے۔ وہ اِس کی معروف اِصطلاحوں سے نہیں کھیلتا۔ وہ اَپنے آپ کو براہِ راست موحّد نہیں کہتا، ترکِ رُسوم سے موحّد دِکھائی پڑتا ہے:

عکس بھی مَیں ہُوں، چہرہ بھی مَیں، آئینہ بردار بھی مَیں
دریا کے اِس پار بھی مَیں ہُوں، دریا کے اُس پار بھی مَیں

ضروری نہیں، صوفی صرف وہی ہو جسے عرفان حاصل ہو چکا ہو۔ منیر سیفی کے ناکام تجربے بھی صوفیانہ ہیں:

نہیں تھا جو نظر آتا بہت تھا
حقیقت کا یہی دھوکا بہت تھا

اَور اِس کیفیت میں کہیں کہیں معرفت اُسے چھو کر گزر جاتی ہے:

وُہ میرے پاس ہی کمرے میں تھا کہیں موجود
جسے میں ڈھونڈ رہا تھا، وُہ آسماں میں نہ تھا

منیر سیفی نہ تو سرمد ہے، نہ خیّام اَور نہ ہی میر درد، مگر لگتا ہے کہ اُس کے لیے زندگی بھی تصوف ہے اَور شاعری بھی تصوف! وحدت الوجود کے فلسفے کو سمجھانے کے لیے صوفیا نے قطرے میں دجلے اَور دجلے میں قطرے کی

ترکیبیں وضع کر رکھی ہیں۔ دیکھیے 'منیر سیفی نے دجلے کو بیچ میں لائے بغیر اسے کس طرح سمجھنے کی کوشش کی ہے:

ذات ہے کوئی اَور ہی شے پہچان سے ہٹ کر
قطرہ دریا میں بھی تنہا ہو سکتا ہے
اِک قطرے کے پیچھے ایک سمندر رقص کُناں تھا
اِک لمحے کے پیچھے کیا کیا ماہ و سال رکھے تھے!

اُس نے صوفیانہ شاعری کے لیے معروف اَصناف......کافی، وائی اَور بَیت......اِختیار نہیں کی ہیں، غزل بہانا کر کے اُسے گنگنایا ہے جس کے ساتھ اُسے حقیقی عشق ہے:

ایک دَرویش پڑھے جائے غزل
ایک دَرویش سدا رقص میں ہو!

میں نہیں جانتا کہ نئے زمانے کے اِس نئے صوفی کے آباؤ اَجداد کہاں سے آئے تھے اَور اِس کا تعلق کسی برگزیدہ خانوادے سے ہے یا نہیں۔ وہ خود کہتا ہے:

اپنے ہاتھوں پہ بھی نہ بیعت کی
اِتنا بھی سلسلہ نہ تھا میرا

مگر اُس کی شاعری کے اَنگ اَنگ میں رُوحانیت کے غیر مادّی خلیے روشن ہیں۔

اِصلاح اَور تزکیۂ نفس کے لیے ذات کی نفی ہمارے صوفیا کا وطیرہ رہا ہے۔ یہ الگ بات کہ وہ اِس نفی ہی میں اِثبات دیکھا کرتے ہیں:

مِرے اِثبات کا ہے فلسفہ کیا
دِیا بجھ کر نہیں رہتا دِیا کیا
نفی کے اَندر جب اِثبات دِکھائی دے
تب ممکن ہے اُس کی ذات دِکھائی دے

منیر سیفی نے بھی اَپنے صوفیانہ تجربات کا آغاز فصیلِ گیسو و رُخسار کو ایک طرف چھوڑ کر ضبطِ نفس ہی سے کیا ہے:

جو تجھ کو منہا کر دے
ہر اُس رُوپ کو دھارا کر
یہ ایک وحشی جو میرے اَندر چھپا ہُوا ہے
اِسے کسی طور مار لیتا، یہی بہت تھا

جب سے پیروں کے نیچے آیا ہُوں
لگتا ہے آسماں نہیں ہُوں مَیں
پھر دریا سے ناتا جوڑا کرتے ہیں
پہلے خود سے خود کو منہا کرتے ہیں

قناعت بھی ضبطِ نفس ہی کا وظیفہ ہے۔ دُنیاوی خواہشوں سے اِجتناب جب بے اِعتنائی کی حدوں تک پہنچتا ہے تو تزکیۂ نفس کی منزل ملتی ہے اَور حرص میں فائدے کے بجائے زیاں دِکھائی دینے لگتا ہے:

بہت کم کم ہے گو سامان اَپنا
نہ ہونے کا تھا اِطمینان اَپنا

منیرسیفی نے اَپنے ایمان کے سونے میں انانیت، کدورت اَور تفرقے کا کھوٹ نہیں ملایا۔ تکبر اَیسے شرکِ خفی سے اُسے ذرّہ بھر نسبت نہیں۔ اُس پر کشفی اُمور اُس کی اپنی باطنیت اَور رُوحانیت سے کھلتے چلے گئے ہیں۔ خواہشوں کی اسیری سے رِہائی نے اُس کے اَندر ایک اَور طرح کا حوصلہ پیدا کیا ہے۔ سیم و زر، زیب و زینت، عیش و عشرت، آرائش و زیبائش اَور تکلّف و تصنّع کی دلدلوں سے نکل کر اُس نے بصیرت، شعور، وجدان اَور آگہی کے کھلے سمندر پر اَپنے بادبان کھولے ہیں:

اجازت مانگنے آیا ہے سُورج
دِیے کو ہو چلا عرفان اَپنا

یہ عرفان اُسے مابعدُالطّبیعی مراحل سے گزر کر حاصل ہوا ہے جس میں بیعت پہلا قدم ہے:

عشق کے سلسلے سے بیعَت ہُوں
نام کیا چیز ہے، نسَب کیا ہَے!

حقیقتِ مطلق کو، حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی طرح، منیرسیفی نے بھی ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا ہے۔ اُس مہدی سے ملن کے لیے وہ مولانا رُومیؒ کی طرح وجد، حال اَور دھمال سے بھی گزرا ہے اَور وُہ بلّھے شاہ اَیسا، اُس کے عشق میں "تھیّا تھیّا" کر کے ناچا بھی ہے:

سجدہ ایک بھی کافی ہَے
لیکن رقص مگر دوبارہ کر!

آگ سی شے ہو کوئی رَگ رَگ میں
ایک اِک انگ مرا رقص میں ہو

اِس ساری غزل کی ردیف ہے "رَقص میں ہو" جس سے مولانا رُومؒ کے مزار پر دَرویشوں کا رَقص یاد آنے لگتا ہے۔

یہی رَقص "پیا پیا کرتے ہمیں پیا ہوئے" اَور "رانجھا رانجھا کردی نی میں آپے رانجھا ہوئی" ایسی کیفیت طاری کرتا ہے اَور ہر طرف "اِکّو رنگ کپاہیں دا" دِکھائی دینے لگتا ہے:

اُس کے سِوا مرے اَندر سے
کس کی ذات نکل سکتی تھی!

جہاں نکلا ہُوں جسم و جاں سے باہر
وہیں پر جسم و جاں کے بیچ مَیں تھا

منیر سیفی بھی "اِک رانجھا مَینوں لوڑی دا" جپتا ہے اَور اُس رانجھے کے حصول کے لیے ذِکر رَقص کی اَور رَقص ذِکر ہی کی صورت ہے۔ اِنہماک، چِلّے، معکُوس چِلّے بھی ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اِس ذِکر اَذکار میں اَیسے لفظ بھی لبوں پر ٹوٹتے ہیں جو کسی ورق پر نہیں ہوتے مگر ٹوٹتے ہیں تو پھر جُڑ بھی جاتے ہیں اَور ذِکر کرنے والا ایسی عجیب سرشاری سے گزرتا ہے کہ بہار اُس میں نہیں رہتی اَور وُہ خزاں میں نہیں ہوتا۔ لیکن اَیسا اُس وقت ہوتا ہے جب دِل میں یہ خواہش زور پکڑتی ہے:

ذِکر ہی اُڑتے پَروں کی پھڑپھڑاہٹ
ذِکر ہی زنجیر ہونا چاہیے تھا

اب آپ کو یہ پَر، فرشتوں کے لگیں یا جُھٹپٹے میں کسی غیر مرئی مہیب پرندے کے، یہ آپ کے اپنے حُسنِ اِدراک پر منحصر ہے۔

رُوحانی واردات اَور سلوک دراصل آپ اَپنی پہچان کا عمل بھی ہے، چاہے آپ ربّ کو اَپنی ذات کے حوالے سے یا اَپنے آپ کو ربّ کے حوالے سے پہچانیں! اَلَست اَپنے آپ کو پہچاننے کی سعی ہے اَور شاہ حسینؒ کی تلقین "اپنا آپ پچھان موئیے" اَور "بندے آپ نوں پہچان" اَور بلّھے شاہ کے "بلّھیا کیہہ جاناں مَیں کون" اَیسے سوالات اُس کی ایک سے زائد غزلوں اَور بہت سے دُوسرے اَشعار میں اُٹھائے گئے ہیں۔ منیر سیفی نے سارے سوالوں کا جواب میر درد کی علم الکتاب میں نہیں، بلّھے شاہ کے "علموں بس کریں او یار، اکّو اَلف ترے درکار" یا "اِک الف پڑھو چھٹکارا اے" اَیسے اَسباق میں پایا ہے:

ہے نقطوں میں طلسم اَے نکتہ چیں، کیا
اَلف سے بات بن سکتی نہیں کیا

اَور تو اَور، اِس میں دِیے اَور فقیر کے ساتھ وُہ کُتّا بھی موجود ہے، جو سب سے بازی لے جاتا ہے۔

منیر سیفی صوفی ہے، راہب نہیں۔ وہ دُنیا کا طلب گار نہیں مگر اِسی دُنیا کا فعّال اور باشعور فرد ہے۔ اُس کا سَر اَفلاک کے سینے پہ ہے مگر پاؤں مٹّی میں پیوست ہیں۔ وہ اپنی ذِمّے داریوں سے گریز نہیں کرتا۔ وہ دُنیا سے یکسر کنارہ کش نہیں ہوتا۔ وہ مِٹا ہُوا ضرور ہے مگر اپنی اِس مٹّی کا قرض چُکانا جانتا ہے جو اپنے میثاق پر قائم رہتی ہے اور جسے ہر وقت ہَوا اور پانی کی سازِش سے خطرہ رہتا ہے:

اُڑتی رہتی مری مٹّی ہر سُو
بڑھتا رہتا مرا رقبہ پھر بھی

آسماں میری بھی منزل ہے مگر رستے میں
کام کچھ دیر ابھی وادیٔ مہتاب میں ہے

وُہ مذہب کے جامِد عقیدوں کو پھر سے جاری کرتا اور اُن میں جذبوں کا رنگ بھرتا ہے:

پہلے نبضِ یقین کی دیکھ
پھر اَوہام کا چارہ کر!

وُہ اِنسان اَور خُدا کے درمیان ٹوٹے ہُوئے تعلق کو پھر سے جوڑتا ہے۔ وہ حضرت ابُوذر غفاریؓ، حضرت عمّار بن یاسرؓ اَور حضرت ابو حنیفہؒ کی طرح کرّوفر سے نفرت کرتا ہے۔ فقر و غنا اَور دَرویشی اُس نے بطورِ احتجاج بھی اپنا رکھی ہے۔ ملوکیت اَور شہنشاہیت کے جبر و تشدّد پر وُہ جلال میں بھی آتا ہے۔ وہ خوشامد اَور منافقت کے خلاف ہے اَور سچّائی کے اِظہار پر یقین رکھتا ہے۔ جھوٹی تحسین و تکریم اَور جعلی اِعزازات کی تقسیم کے بیچ وُہ احتیاط کا لبادہ ہی نہیں اوڑھتا، سرزنش سے بھی کام لیتا ہے:

ابھی شعروں میں کچھ کچھ روشنی تھی
اگرچہ لفظ گونگے ہو چکے تھے

اَور بھی کوئی تھی پریشانی
عشق ہی مسئلہ نہ تھا میرا

یہ کیا کہ عدل صاحبِ ثروَت ہی پا سکے
زنجیر اَیسی ہو کہ ہَوا بھی ہلا سکے

تاریکی کی قسمت بدلنے اَور کسی بستی کا ستارہ ہونے کے لیے احتجاج کی یہ دبی دبی چنگاری، منیر سیفی کے ہاں کسی پَل بغاوت کا شعلہ بھی بن جاتی ہے۔ ایسی حالت میں وُہ اِس بات سے بھی نہیں ڈرتا کہ:

مجھ کو زندہ بھی دفنایا جا سکتا تھا

اُس کی غزل:

ایسی بھی صُورتِ حالات نہ سمجھی جائے
میری پسپائی، مِری مات نہ سمجھی جائے

اِسی اِضطراب کی غمّاز ہے جو اِصلاحِ احوال کی کوششوں میں ناکامی سے پیدا ہوتا ہے، اَور اِس مرحلے پر منیر سیفی ابنِ فارض، باہُو، ابُوسعید ابُوالخیر اَور جامی سے زیادہ منصور، ذوالنّون مصری، ابُوحمزہ، سُہرَوردی اَور سرمد سے متاثر معلوم ہوتا ہے۔

کلاسیکی دَور سے میر درد تک کی شاعری میں حقائق ومعارف، اَسرارِ تصوف، حکمت، اِشراق، سُلوک، تعیّنات اَور تنزلات کے اِنجذاب سے جس روایت نے جنم لیا تھا اَور کائنات کی بے ثباتی، قلبی واردات اَور جس معاملہ بندی نے راہ پائی تھی، منیر سیفی تک آتے آتے اُن کے اِمکانات میں اَور بھی وسعت پیدا ہوئی ہے۔

منیر سیفی کی غزل اِس روایت کے تسلسل میں ایک نئے شعور کی نشاندہی کرتی ہے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے لے کر آج تک ظہور کرنے والے صوفیا اَور صوفی شعرا کے اَفکار اَور اَسالیب کے اِمتزاج سے منیر سیفی نے اَپنا اَندازِ نظر مرتّب کیا ہے۔ اِس پر مستزاد اُس کا اَپنا کردار ہے جو اُس کی زندگی کے چلن کی اَور اُس کی شاعری کی بیک وقت نمائندگی کرتا ہے۔ اِن دِنوں تو ہر مفاد پرست اَور دُنیادار بے عمل عالم، ملامتیہ اَفکار کو اَپنی ڈھال بناتا ہے اَور تصوف سے ناواقف اُس کے نادان مدّاح اُسے بے کھٹکے ملامتی صوفی اَیسے تقدس کا حامل سمجھنے لگتے ہیں، مگر خدا کی نیابت اَور اُلوہی صفات نے شاید منیر سیفی کو پرومیتھیس اَیسے کلاسیکی کردار سے قریب تر کیا ہے اَور اُس نے بھی اِس طلسم سے غیر محسوس طَور پر اِستفادہ کیا ہے۔ اُس کی باطنی منطق پر قائم بالذّات یہ شعری مجموعہ اَپنی ایک فعال، متحرک اَور بارونق دُنیا تخلیق کرتا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ منیر سیفی کے جذبہ وشوق کی یہ ہمہ گیری اِس مجموعے کے قارئین کو اَپنی گرفت میں لے گی اَور اُنھیں پہلے سے مختلف کر دے گی۔

ضروری نہیں ہوتا کہ حقیقی شاعر اَپنے اَشعار کے مطالب بھی جانتا ہو:

اَپنے اَشعار خود سمجھ لُوں مَیں
میرا اِتنا مُطالعہ بھی نہیں

منیر سیفی کی یہی اُلجھن میری بھی ہے کہ میرا مطالعہ بھی اِتنا نہیں کہ اُس کے شعروں کی آبنائے کی حوصلے سے غوطہ زنی کر سکوں۔ تاہم جو گوہر اِس غوّاصی میں میرے ہاتھ لگے ہیں، اُن کی چمک سے کسی ایک قاری میں بھی اُس کی شاعری میں اَور گہرا اُترنے کی خواہش جاگ اُٹھے تو میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں رہی۔

☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عقیدت

حمد

چھت ہے دیوار و در ہے
یہ تو اپنا ہی گھر ہے

رشک آئے بینائی پر
آنکھ میں ایسا منظر ہے

کل مَیں گھر کے اندر تھا
اب گھر میرے اندر ہے

اِک قطرے کے سواگت کو
کتنا بڑا سمندر ہے

پھر دل کی بن آئی ہے
پھر جلووں کی زَد پر ہے

بند آنکھوں جا سکتا ہُوں
اب تو رستہ اَزبر ہے

بے کھٹکے چلتے رہنا !
درد جہاں تک رَہبر ہے

اپنے آپ کو بیچ دیا
دِل کیسا سَوداگر ہے

مٹّی پر کیا بِیت گئی !
ہر چہرہ جادُوگر ہے

سجدے سے کیسے اُٹھّوں
اب تو سَر ہی شہہ پر ہَے

چشمے خشک نہیں ہوں گے
دریا میرے اَندر ہَے

خاموشی کے پردے میں
آوازوں کا محشر ہَے

اشکوں کے پیچھے پیچھے
آہوں کا اِک لشکر ہَے

جب اَشکوں میں باتیں ہوں
چُپ رہنا ہی بہتر ہَے

ہُوں بھی اَور نہیں بھی ہُوں
یہ بھی کیسا چکّر ہَے

دُنیا کیوں ٹھوکر پر تھی
دُنیا کیوں ٹھوکر پر ہے

جس میں سب منظر کھو جائیں
ایسا بھی اِک منظر ہے

کل مَر جاتا، بہتر تھا
آج تو حالت بدتر ہے

اُس پر غزلیں لِکھتا ہُوں
وُہ جو حمد سراسر ہے

......

نعت

آپؐ کی نسبت سے ہُوں
اِس لیے عزّت سے ہُوں

مُعتبر سرکارؐ کے
نام کی برکت سے ہُوں

کم یہ سرمایہ نہیں
آپؐ کی اُمّت سے ہُوں

دِل کی مَعبد گاہ میں
مُعتکِف مدّت سے ہُوں

شکر ہے پتھر نہیں
آئنہ حیرت سے ہُوں

میری کیا اَوقات ہے !
کب یہاں ہمّت سے ہُوں

آپؐ کے دربار میں
آپؐ کی رحمت سے ہُوں

ہونا ہے اِس شہر میں
چاہے جس صُورت سے ہُوں

کُھل کے رونا ہے مجھے
آج مَیں فرصت سے ہُوں

آج بھی زندہ منیرؔ
ہجر کی لذّت سے ہُوں

......

نعت

ترئ تحریکِ سرمدٗ تیرئے دستورِ مخلّد کا
زمانہ منتظر اِک عہد سے تھا تیریٔ آمد کا

ضرورت اُس کو مکتب کی نہ وہ محتاج اَبجد کا
جو دِل قسمت سے مسکن بن گیا حرفِ مشدّد کا

زمانے چھاؤں میں جس کی پڑے آرام کرتے ہیں
تمھاری ذات میں آقاؐ ہے اَیسا پیڑ برگد کا !

کبھی اَفلاک سے اُترا نہ دیکھا خاک نے کوئی
تِری صُورت، تِری سیرت، تِرے قامت، تِرے قد کا

روا رکھتے ہیں جو سرکارؐ اب بھی نوعِ انساں سے
کوئی اندازہ کر سکتا ہے کیا اُس لطفِ بے حد کا!

دھمالیں پھر مِری تُم دیکھنا جب مِل گئی مجھ کو
کوئی اُترن ہی اُس در سے، کوئی صدقہ ہی احمدؐ کا

جدھر دیکھیں نظر آتی ہیں آیاتِ مُبیں سیفیؔ!
جہاں کیا ہے، فقط آئینہ خانہ ہے محمدؐ کا

......

نعت

یہ کس روشن اداؐ کی روشنی ہے!
مِرے اندر بلا کی روشنی ہے!

ہمیشہ سے ہمیشہ تک رہے گی
یہ محبوبِؐ خُدا کی روشنی ہے

نہیں کُھلتا مدینے کے اُفق پر
دِیوں کی یا ہَوا کی روشنی ہے!

رُخِ انورؐ نہ کیوں پردوں میں ہوتا
نبوّت ...... اِنتہا کی روشنی ہے !

کہیں بدر و اُحد کی ضَو فِشانی
کہیں ثوَر و حِرا کی روشنی ہے

کہیں ہے چاندنی بدرُالدّجیٰ کی
کہیں شمسُ الضّحیٰ کی روشنی ہے

قیامت تک اِسے رہنا ہے رَوشن
یہ اُنؐ کے نقشِ پا کی روشنی ہے

زمیں پر روشنی شمس و قمر کی
فلک پر کربلا کی روشنی ہے

دُرُودوں کا کہیں سایہ ہے سیفیؔ
کہیں حرفِ ثنا کی روشنی ہے !

......

نعت

زمیں سے آسماں تک اَور کیا اِس کے سِوا دیکھا
جہاں دیکھا، جدھر دیکھا، جہانِ مصطفیٰؐ دیکھا

کچھ ایسے آئی تھی اِس بار مجھ کو یاد اُس گھر کی
نہ پھر زادِ سفر دیکھا نہ میں نے فاصِلہ دیکھا

کبھی اُس در پہ دستک دینے کی نَوبت نہیں آتی
وہ دروازہ ہی ایسا ہے، جسے پیہم کھُلا دیکھا

مَبادا لب کُشائی سے کوئی نقصان کر بیٹھوں
درِ اَقدس پہ چُپ رہنے ہی میں ہے فائدہ دیکھا

اُٹھا کر دیکھ لی تاریخ مَیں نے نوعِ انساں کی
نہ خادِم بُو قحافہؓ سا ' نہ مالِک آپؐ سا دیکھا

دِکھائی جھلکیاں دیتی ہیں جس میں کنزِ مخفی کی
حبیبِؐ کبریا کی شکل میں وُہ آئینہ دیکھا

فلک نے کب کوئی دیکھا مدرِّس اُن کے قامت کا
زمیں نے کب کوئی ارقمؓ کے گھر سا مدرَسہ دیکھا

کلامِ پاک کی صُورت' رَسُولِؐ حق کی سیرت کو
ہے جب بھی غور سے دیکھا' کوئی پہلو نیا دیکھا

دُعائے خیر کرنا دُشمنوں کے واسطے سیفیؔ
رَسُولِ پاکؐ جیسا اَور کس میں حوصلہ دیکھا !

......

منقبت

در مدح

حضرت خواجہ معین الدین چشتیؒ

یہ جو دروازہ شہرِ چشت کا ہے
راستہ یہ بھی اِک بہِشت کا ہے

آئِنے ہر طرف ہیں آویزاں
داخلہ بند سنگ و خِشت کا ہے

موسم اَجمیر سے اُٹھا لائے !
فکر جس کو بھی اپنی کِشت کا ہے

ایک سا اَبر' ایک سی بارِش
فرق بس خاک کی سرِشت کا ہے

سِلسِلہ کوئی سا اُٹھا دیکھیں
فلسفہ سارا خوب و زِشت کا ہے

اُٹھّے بنیاد خاکِ طَیبہ سے
مسئلہ صرف پہلی خِشت کا ہے

آپؐ کی لَوح' آپؐ کا ہے قلم
کام اَب میری خود نوِشت کا ہے

اہلِ ایماں کے ساتھ ساتھ اُنھیں
دُکھ کَلیسا کا' غم کَنِشت کا ہے

درِ خواجہؒ کا ہر فقیر' منیؔر!
آدمی لازماً بہِشت کا ہے

منقبت

در مدح

حضرت علی ہجویریؒ المعروف داتا گنج بخشؒ

گاہ سُورج گہے دِیا چہرہ
روشنی روشنی ...... تِرا چہرہ

ہے جُدا اور نہیں جُدا چہرہ
دیکھتا، سُنتا، جانتا چہرہ

کیا بتاؤں کہ کیسے بنتا ہے
ایک نقطے سے دائرہ چہرہ

رقص فرما ہوئی تھی ایک کرن
پانیوں نے بنا لیا چہرہ

عکس در عکس پھیلی خوشبوئیں
آئینہ آئینہ کِھلا چہرہ

سایے کو مِل گیا ترا قامت
عکس نے پا لیا ترا چہرہ

ایسے چہرے ہیں کم زمانے میں
آپؐ کو جو عطا ہُوا چہرہ

شرحِ قرآں ہیں آپؐ کی باتیں
مظہرِ حق ہے آپؐ کا چہرہ

مجھ سے ناقص کا پیرِ کامل ہے
ایک لاکھوں میں رہنما چہرہ

ہو گئیں مُشکلیں سبھی آساں
بن گیا ہاتھ پر دُعا چہرہ

کیا سے کیا صُورتیں نظر آئیں
کیا سے کیا رُونما ہُوا چہرہ

ہے نگہبان میری نیندوں کا
تیرا راتوں کو جاگتا چہرہ

میں تو قدموں پہ جان دے ڈالوں
تیرا چہرہ ہے پھر تِرا چہرہ

تاب اِتنی کہاں تھی مجھ میں منیر
مَیں کن آنکھوں سے دیکھتا چہرہ!

......

غزلیں

ایک تماشا اَور دِکھایا جا سکتا تھا
مجھ کو زندہ بھی دفنایا جا سکتا تھا

چڑیوں کی آواز نہ کانوں تک آ سکتی
گھر میں اِتنا شور مچایا جا سکتا تھا

جب تک برف پگھلتی یا برکھا رُت آتی
دریا اَور بھی کام میں لایا جا سکتا تھا

تم نے اپنا رستہ خود روکا تھا ورنہ
تم جب آنا چاہتے، آیا جا سکتا تھا

چھوٹی چھوٹی خوشیاں بانٹی جا سکتی تھیں
ہنستے ہنستے غم اَپنایا جا سکتا تھا

کتنا ہی مصرُوف تھا پھر بھی اپنی خاطر
تھوڑا سا تو وقت بچایا جا سکتا تھا

جتنے وقت میں تُم نے گھر آباد کیا ہے
اُتنے وقت میں شہر بسایا جا سکتا تھا

گردن میں بَل آنا ہی تھا پھر بھی سیفؔی!
بوجھ ذرا سا اَور اُٹھایا جا سکتا تھا

......

جب طُوفاں کے بیچ کِنارہ ہو سکتا تھا
دریا کے باہر بھی دھارا ہو سکتا تھا

اِک دیوار گرانے' اِک پردہ اُٹھنے سے
اندر باہر ایک نظارہ ہو سکتا تھا

تاریکی کی قسمت بدلی جا سکتی تھی
ہر بستی میں ایک سِتارہ ہو سکتا تھا

قریہ قریہ خاک اُڑائی جا سکتی تھی
میری آنکھوں کا بٹوارا ہو سکتا تھا

جاں دے کر ستے میں جان بچالائے ہو!
ورنہ عِشق میں اور خسارہ ہو سکتا تھا

کب تک رستہ خُوشبوؤں کا روکے رہتے
کب تک اپنا جسم گوارا ہو سکتا تھا!

اوّل اوّل آگ بُجھائی جا سکتی تھی
اوّل اوّل درد کا چارہ ہو سکتا تھا

جانے سے پہلے اِتنا تو سوچا ہوتا
درد مِرے دل میں دوبارہ ہو سکتا تھا

تنکے نے بھی آس لگائی ہوگی مجھ پر
جب تنکے کا مجھے سہارا ہو سکتا تھا

کیا ہونا تھا ڈوبنے والے کی آنکھوں میں
ایک گھروندا ' ایک کنارہ ہو سکتا تھا

سیفؔی بے شک عیب نمایاں کر دیتیں وہ
روشنیوں کے بیچ گزارا ہو سکتا تھا

......

۞

وُہ مزاج آشنا نہ تھا میرا
بجھ گیا سو دِیا نہ تھا میرا

زخم بھی تیری شکل ایسے نہ تھے
درد بھی آئینہ نہ تھا میرا

چین کی نیند سویا کرتا تھا
خود سے جب رابِطہ نہ تھا میرا

سارے رستے تھے مہرباں مجھ پر
جب کوئی راستہ نہ تھا میرا

اپنے ہاتھوں پہ بھی نہ بیعَت کی
اِتنا بھی سِلسِلہ نہ تھا میرا

اَور بھی کوئی تھی پریشانی
عِشق ہی مسئلہ نہ تھا میرا

تھا میسّر میں خود کو اُس لمحے
جب کہیں بھی پتا نہ تھا میرا

دیکھتا ڈوبتے ہُوئے خود کو
اِس قدر حوصلہ نہ تھا میرا

یہ جہاں راکھ اُڑتی رہتی ہے
اِس جگہ آشیانہ تھا میرا

مَوت ہی میں نجات ممکن تھی
حل کوئی دُوسرا نہ تھا میرا

بات سب وقت وقت کی ہے منیرؔ
وہ بھی دِن تھے، زمانہ تھا میرا

......

۵۵

ہَوا کے ساتھ سفَر اِختیار کرنا تھا
دیارِ شب کو خموشی سے پار کرنا تھا

ہماری خاک کوئی چاندنی میں ڈال آئے!
ہمارا کام سِتارے شکار کرنا تھا

ہُوئی تھی اِس لیے تاخیر تجھ سے مِلنے میں
خود اپنا بھی تو مجھے اِنتظار کرنا تھا

ہزار آئینہ رکھنا تھا رُوبرُو لیکن
کچھ اپنے آپ کا بھی اِعتبار کرنا تھا

ہماری سمت بھی اِک سِکّہ مسکراہٹ کا -
ہمیں بھی اپنی رعایا شمار کرنا تھا

ابھی سے تم نے مجھے بے کَنار کر ڈالا
ابھی تو تم نے مجھے ہم کَنار کرنا تھا

فلک تو بھُول بھی سکتا تھا لغزشیں سیفیؔ!
مگر زمیں کو ہمیں شرمسار کرنا تھا

......

۞

وہ جب رونا بھول گیا تھا
دریا رستہ بھول گیا تھا

مٹّی تھی میثاق پہ قائم
پانی وعدہ بھول گیا تھا

صرف اِک صُورت یاد رہی تھی
باقی دُنیا بھول گیا تھا

آئینہ تو لے آیا تھا
چہرہ لانا بھُول گیا تھا

جاں بخشی بھی ہو سکتی تھی
میں چُپ رہنا بھُول گیا تھا

یوں تو اِک آواز تھا مَیں بھی
لَوٹ کے آنا بھُول گیا تھا

ایک دِیا تھا میں بھی لیکن
جَل کر بُجھنا بھُول گیا تھا

بستے میں ہر شَے رکّھی تھی
بچپن رکھنا بھُول گیا تھا

پھر وہ رات بھی آئی سیفیؔ!
سو کر اُٹھنا بھُول گیا تھا

......

۱۱

نہیں تھا جو نظر آتا بہت تھا
حقیقت کا یہی دھوکا بہت تھا

یہ سیرابی ہے صحرا کی بدولت
میں جب دریا میں تھا' پیاسا بہت تھا

ہَوا پانی سے سازِش کر رہی تھی
مِری مٹّی، تجھے خطرہ بہت تھا!

بگڑتی کیوں نہ پھر عادت ہماری!
غموں کے درمیاں وقفہ بہت تھا

وہ کچّی خواہشوں کے دن بھی کیا تھے!
کہ جب تِتلی کو چھُو لینا بہت تھا

وُہ مَر جاتے تھے سب کِردار جس کے
وُہ ناٹک شہر میں چلتا بہت تھا

بہت مشکل تھا اپنے ساتھ رہنا
میں اپنے آپ سے چھپتا بہت تھا

اُسی کی تم گواہی دے رہے تھے
اُسی کے ضبط کا چرچا بہت تھا

اُسے بھی ناگ نے بَل دے رکھے تھے
مجھے بھی زہر کا نشّہ بہت تھا

غزل کی نوکری میں مجھ کو سیفؔی!
بہت کم فائدہ ' گھاٹا بہت تھا

۵۵

یہ بوجھ سَر سے اُتار لیتا ، یہی بہت تھا
میں عُمر یُوں ہی گزار لیتا ، یہی بہت تھا

یہی بہت تھا میں اپنی آنکھوں سے تکتا اُس کو
وُہ نام میرا پکار لیتا ، یہی بہت تھا

وُہ شام لمحہ، وُہ نام ہچکی، وُہ شرم آنسُو
اُس ایک پَل کو سنوار لیتا ، یہی بہت تھا

یہ ایک وحشی جو میرے اندر چھُپا ہُوا ہے
اِسے کسی طرح مار لیتا ' یہی بہت تھا

اُٹھاتا چاہے نہ وہ اُٹھاتا مجھے زمیں سے
فلک سے خود کو اُتار لیتا ' یہی بہت تھا

یہی بہُت تھا ' دُرُست رکھتا حسابِ جاں کو
میں اَور کیا کیا اُدھار لیتا ' یہی بہت تھا !

......

۱۱

کلی میں خُوشبُو اُتر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا
ہَوا کی جب گود بھر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا

کہاں تھے تم جب فرشتے تقدیر لکھ رہے تھے!
زمیں کی قسمت سنور رہی تھی تو مَیں کہاں تھا

ہمارے نقش و نگار تشکیل پا رہے تھے
ہماری صُورت نکھر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا

ارادے ایک ایک کر کے ٹوٹے تو تُم کہاں تھے!
اُمید گھر دِل میں کر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا

کہاں تھے تم جب شفَق نے حرفِ نجات لِکّھا
عذاب کی شام مَر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا

وُہ ایک ساعَت جو اِک صدی پر گَراں تھی سیفیؔ!
وُہ ایک ساعَت گزر رہی تھی تو مَیں کہاں تھا

.....

۵۵

زمین و آسماں کے بیچ مَیں تھا
حصارِ بے کراں کے بیچ مَیں تھا

فصیلِ ناتواں تھی چاروں جانب
دیارِ بے اَماں کے بیچ مَیں تھا

تو پھر وُہ دُوسرا سایہ تھا کس کا!
اگر خالی مکاں کے بیچ مَیں تھا

جہاں نکلا ہوں جسم و جاں سے باہر
وہیں ہر جسم و جاں کے بیچ مَیں تھا

ہمیشہ ممتحن تم ہی بنے تھے
ہمیشہ اِمتحاں کے بیچ مَیں تھا

قدم مغرب کو، رُخ مشرق کی جانب
یہ کیسے کارواں کے بیچ مَیں تھا

وہ آنکھیں حرفِ رُخصت لکھ رہی تھیں
نہ جانے کس گُماں کے بیچ مَیں تھا!

طِلسمِ رَفتگاں ٹُوٹا تو سیفیؔ
غمِ آیندگاں کے بیچ مَیں تھا

......

۱۱

یہ دن بھی آئیں گے مجھ پر کبھی گُماں میں نہ تھا
زمین ہی پہ تھا لیکن میں اِس جہاں میں نہ تھا

اِک ایسی شام تھی، سُورج جلا رہا تھا چَراغ
اِک ایسی صبح تھی، سایہ بھی سائِباں میں نہ تھا

لبوں پہ لفظ جو ٹوٹے کسی وَرَق پہ نہ تھے
جو حرف اشک نے لکّھا، کسی زباں میں نہ تھا

وہ میرے پاس ہی کمرے میں تھا کہیں مَوجُود
جسے میں ڈھونڈ رہا تھا' وہ آسماں میں نہ تھا

میں اُن دنوں عجب اِک کیفیت سے گزرا ہُوں
بہار مجھ میں نہ تھی اَور میں خزاں میں نہ تھا

یہ جو بھی ہے' مِرا اَپنا کِیا دَھرا ہے منیؔر!
کسی طرح بھی وہ راضی مِرے زِیاں میں نہ تھا

......

۵۵

سانس کو شمشیر ہونا چاہیے تھا
درد کو تصویر ہونا چاہیے تھا

کیا ہُوا گر لوگ پڑھتے ہی نہیں تھے
حرف تو تحریر ہونا چاہیے تھا

ذِکر ہی اُڑتے پَروں کی پھڑپھڑاہٹ
ذِکر ہی زَنجیر ہونا چاہیے تھا

ورنہ سَر پر سَو بلائیں ٹُوٹ جاتیں
آسماں تعمیر ہونا چاہیے تھا

کیا ہُوا، یہ زخم بھرتے کیوں نہیں ہیں
وقت کو اِکسیر ہونا چاہیے تھا

یُوں ہمارے ٹوٹ جانے کا تمھیں بھی
رنج دامن گیر ہونا چاہیے تھا

جو پلَٹ آنے کے فن میں طاق ہوتا
ایک اَیسا تیر ہونا چاہیے تھا

ایک تنکے کی بھَلا وَقعت ہی کیا تھی
آنکھ میں شہتیر ہونا چاہیے تھا

اشک میرے کارکُن ہوتے نہ ہوتے
غم مِری جاگیر ہونا چاہیے تھا

......

۵۵

دستِ دُعا لگا کبھی حرفِ دُعا لگا
مجھ کو وہ سارا شہر ہی اِک معجزہ لگا

اُس وقت میرے سامنے لایا گیا مجھے
جب اپنا آپ بھی مجھے نا آشنا لگا

یُوں بھی ہُوا کہ شکل ہی اپنی بگاڑ لی
جب بھی ہمارے ہاتھ کوئی آئینہ لگا

یُوں بھی ہُوا کہ فاصلے بڑھتے چلے گئے
یُوں بھی ہُوا کہ دَشت مِرے گھر سے آ لگا

مدّت کے بعد لَوٹ کے آیا تو اَپنا گھر
کتنا اُداس ' کتنا ہی بدلا ہُوا لگا

دریا کی دوستی کا بھروسا نہیں منیر !
ڈوبا میں صبح ' شام کنارے سے جا لگا

سیفیؔ ، کبھی حصارِ شجر سے نکل کے دیکھ !
اِک روز تُو بھی اپنے پَروں کو ہَوا لگا

......

۵۵

ہَوا کا سامنا کرنا پڑے گا
دِیے کو حوصلہ کرنا پڑے گا

طِلسمِ نقطۂ و خط سے نکل کر
مکمل دائرہ کرنا پڑے گا

بہت بھَونچال آنے لگ گئے ہَیں
زمیں سے رابِطہ کرنا پڑے گا

تو کیا اب سبز چشمے ہی پہن کر،
ہمیں منظر ہَرا کرنا پڑے گا ؟

مِرا نقصان بھی ممکن ہے لیکن
مجھے اب فیصلہ کرنا پڑے گا

میں کوئی عکس ہُوں یا آئینہ ہُوں
یہ حل اب مسئلہ کرنا پڑے گا

مِری پہچان بنتے جا رہے ہو
تمھیں خود سے جُدا کرنا پڑے گا

مِرے پیچھے بھی کچھ لوگ آ رہے تھے
سو اب اپنا پتا کرنا پڑے گا

ہدَف پر فاختائیں آ گئی ہیں
نشانے کو خطا کرنا پڑے گا

اگر ہے صُبح کی خاطِر تو سیفیؔ
ہمیں یہ رَت جگا کرنا پڑے گا

......

۶۵

بہت کم کم ہے گو سامان اپنا
نہ ہونے کا تھا اِطمینان اپنا

اُٹھانا ہے ابھی سَر اَپنے آگے
چکانا ہے ابھی احسان اپنا

......

جہاں بھی فاختائیں دیکھتا ہُوں
بچھا دیتا ہُوں دستر خوان اپنا

نہ ہو جس رات دروازے پہ دستک
میں ہو جاتا ہوں خود مہمان اپنا

ہمیں ہیں جو گرفتاری سے پہلے
ادا کر آئے ہیں تاوان اپنا

اجازت مانگنے آیا ہے سُورج
دِیے کو ہو چلا عِرفان اپنا

کسی سے گفتگو ہی گفتگو میں
مکمل ہو گیا دِیوان اپنا

وہیں اُٹھ آؤں گا سیفیؔ، دُکاں سے!
جہاں پورا ہُوا نقصان اپنا

......

۞

آئینہ رستہ مِرا تکتا رہا
میں خود اپنے سامنے بیٹھا رہا

اشک اُس کی آنکھ میں پتھرا گئے
درد میرے جسم سے بہتا رہا

ایک کُتّا، اِک دِیا اور اِک فقیر
اِک تماشا رات بھر ہوتا رہا

جاں سمندر کے لبوں پر آ گئی
چاند اپنے عکس میں کھویا رہا

ڈھے گئیں پَل بھر میں دیواریں تمام
اِیستادہ صِرف دروازہ رہا

دُھوپ نے کیا کیا نہیں لالچ دیے!
پیڑ اپنی چھاؤں میں سویا رہا

حُسن کو ہر پَل گواہی کی طلب
عشق ہر اِنکار میں زندہ رہا

چل دیے سب لوگ شہرِ وصل کو
میں دیارِ ہجر میں ٹھہرا رہا

جب ''نہیں ہونا'' ہی ''ہونا'' تھا منیرؔ
اپنا ہونا بھی مجھے کھَلتا رہا!

......

۶۶

سونے والوں کو کوئی خواب دِکھانے سے رہا
میں تہہِ خاک تو اب خاک اُڑانے سے رہا

کوئی دروازہ نہ حائل کوئی دہلیز رہی
عِشق صحرا میں رہا اور ٹھکانے سے رہا

ڈوب جائیں تو کنارے پہ پہنچ سکتے ہیں
اب سمندر تو ہمیں پار لگانے سے رہا

اِن دِیوں ہی سے کسی طَور گزارا کر لو !
اب مَیں کمرے میں سِتاروں کو تو لانے سے رہا

اپنے ہاتھوں ہی شکار اَپنا میں کرلُوں نہ منیرؔ!
اَور کچھ دیر اگر دُور نِشانے سے رہا

......

۵۵

اِتنے پُر مغز ہیں دلائل کیا !
دِل کو کر لو گے اپنے قائل کیا !

پھر وُہی سَر ہے اوِر وُہی تیشہ
عِشق کیا، عِشق کے وَسائل کیا !

رَوشنی رَوشنی پکارتے ہو
رَوشنی کے نہیں مسائل کیا !

روز مَیدانِ جنگ بنتا ہُوں
مجھ میں آباد ہیں قبائل کیا!

کس قدر عرضیاں گزاری ہیں
کبھی دیکھی ہے میری فائل کیا!

ہاتھ پھَیلانا کوئی کم تو نہیں
پیٹ دِکھلائے تم کو سائل کیا

بیٹھے اب کرچیاں سمیٹتے ہو
اپنے رستے میں خود تھے حائل کیا!

رات بھر جاگتے رہے ہیں درخت
کوئی پنچھی ہُوا ہے گھائل کیا!

بات بے بات ہنس رہے ہو منیرؔ
یوں اثرِ غم کا ہوگا زائل کیا!

......

ہے نقطوں میں طلسم اَے نکتہ چیں کیا!
''الف'' سے بات بن سکتی نہیں کیا!

......

ہزاروں آئِنے ہیں چاروں جانب
یہ رَونق کم ہے' اَے خلوَت نشیں کیا!

گزر کر ''لا'' سے آگے جان لو گے!
مکاں کیا' لامکاں کیا ہے' مکیں کیا

سِتارے تو مِری اِک جَست پر ہیں
سِتاروں سے بھی آگے ہے زمیں کیا

ہَوا کا اِک اِشارہ بھی بہت ہے
حَباب آسا ہُوں مَیں، میرا یقیں کیا!

کوئی سایہ نہ سرگوشی نہ آہٹ
ہُوئے ہیں میری بستی کے مکیں کیا!

بتانِ وہم کا مسکن ہیں، سیفیؔ
خرد کا آستاں کیا، آستیں کیا!

......

مِرے اِثبات کا ہے فلسفہ کیا ؟
دِیا بجھ کر نہیں رہتا دِیا کیا ؟

اگر ہونے کی کڑیاں ہیں سلامت
نہیں ہونے کا ہے پھر سِلسِلہ کیا ؟

تمھیں کہنا تھا جو، تم کہہ چکے ہو
سُنا دیں ہم بھی اپنا فیصلہ کیا ؟

تھکے ماندے دکھائی دے رہے ہو
مکمل ہو گیا ہے دائرہ کیا ؟

پرندے اِس قدر تو جانتے ہیں !
لکھے گی کب درختوں پر ہَوا کیا

یہ کیسے آ گئے آنکھوں میں آنسو !
نہیں ہونے کا میرے دُکھ ہُوا کیا ؟

نہ کر پائیں اگر بچّوں سی باتیں
بڑے ہونے کا پھر ہے فائدہ کیا ؟

چُرا لیتا ہُوں مَیں ہی آنکھ سیفیؔ !
دِکھائے اَور مجھ کو آئینہ کیا

......

در تلک ہی تھا دستکوں کا سفر
اِس سے آگے ہے خوشبوؤں کا سفر

نیند کب تک چبھے گی آنکھوں میں
ختم کب ہوگا رَت جگوں کا سفر

روشنی بانٹنے میں رات کٹی
دِن میں طے ہوگا جگنوؤں کا سفر

کون اُترا ہے سیپ کے دل میں
کس نے دیکھا ہے موتیوں کا سفر!

پھول کھِلتے بھی ہیں بکھرتے بھی
کب سے جاری ہے موسموں کا سفر!

تم زمینوں کے پیار میں سرشار
ہم کو درپیش پانیوں کا سفر

اپنی مٹّی اُٹھا کے چلنا ہے
اَور اُس پر ہے بارشوں کا سفر

دل سے آنکھوں کا فاصِلہ ہی کیا
گھر سے گھر تک ہے آنسوؤں کا سفر

اب تو منزل قریب ہے سیفؔی!
اب تو باقی ہے کچھ دِنوں کا سفر

۷۷

دل میں درد اُتارا کر!
اِک اِک اشک سِتارہ کر!

جو تجھ کو منہا کر دے
ہر اُس رُوپ کو دھارا کر!

کون اِس دشت میں آتا ہے
اپنے ساتھ گزارا کر!

وقت کے اندھے کنوئیں میں تُو
اپنا نام پکارا کر!

دروازے کُھل جائیں گے
سَر دیوار سے مارا کر !

سجدہ ایک بھی کافی ہے
رقص مگر دوبارہ کر !

پہلے نبض یقیں کی دیکھ ،
پھِر اَوہام کا چارہ کر !

بات تو جب ہے دریا سے
دریا بیچ کنارہ کر !

چُپ ہونے ہی والا ہُوں
کچھ دِن اَور گوارا کر !

مَیں تیرا آئینہ ہُوں
آ ، اپنا نظّارہ کر !

....

جا کر بھی نہیں جائے مِرے گھر سے نکل کر
منظر ہی میں رہتا ہے وُہ منظر سے نکل کر

کچھ روز مجھے کچھ بھی سُجھائی نہیں دے گا
آیا ہُوں اندھیروں کے سمندر سے نکل کر

کیا چیز ہے سُورج کبھی بجھتا ہی نہیں ہے
ہر روز چلا آتا ہے ساگر سے نکل کر!

جیسی بھی سہی چھت تو مِرے سَر پہ ہے، ورنہ
بازار میں آ جاؤں گا مَیں گھر سے نکل کر

میں حُر ہوں نہ مقصد ہی کوئی ہے مِرے آگے
جاؤں گا بھلا مَیں کہاں لشکر سے نکل کر!

یہ عشق مِری جان بھی لے سکتا ہے سیفیؔ!
آنا ہے مجھے درد کے پیکر سے نکل کر

......

۵۵

جب تلک تھی اُڑان سب سے الگ
تھا مِرا آسمان سب سے الگ

حُسن کے اَقرِبا جُدا سب سے
عِشق کا خاندان سب سے الگ

ہر حقیقت کے اپنے شکوک
ہر یقیں کا گُمان سب سے الگ

گفتگو حرف کی نہیں مُحتاج
خامُشی کی زبان سب سے الگ

مختلف سب سے ہے نصاب مِرا
ہو مِرا اِمتحان سب سے الگ

خود کو رکھنا ہے سامنے ہر پَل
اپنا رکھنا ہے دھیان، سب سے الگ

ہَیں جُدا صُورتوں سے عکس، منیؔر!
آئینہ درمیان، سب سے الگ

......

۱۱

اپنے اندر گُونجا ہُوں
میں کیسا سنّاٹا ہُوں

جب بچّوں میں ہوتا ہُوں
میں بچّہ بن جاتا ہُوں

کِتنا اچھّا لگتا ہَے!
آپ اپنا ہمسایہ ہُوں

دروازے کے پیچھے سے
خود کو تکتا رہتا ہُوں

خود ہی اُٹھ کر چل دُوں گا
اپنے گھر میں بیٹھا ہُوں

خُوشبُو پھیلتی جاتی ہے
شعر ہَوا پر لکھتا ہُوں

میرا کام بتائے گا
مَیں کتنے دِن جیتا ہُوں

کتنا خرچ ہُوا ہُوں مَیں !
ہر شب خود کو گِنتا ہُوں

یہ تو تُم بھی جانتے ہو
جب چاہُوں مر سکتا ہُوں

اب تو قید بھگت لی ہے
اب تو مَیں جا سکتا ہُوں

کوئی بات تو ہوتی ہے
پاگل ہُوں جو روتا ہُوں

اَب تو جُڑنا مشکل ہے
اَب اَندر سے ٹُوٹا ہُوں

کوئی تھاہ نہیں جس کی
اُس دریا میں اُترا ہُوں

تم نے یہ بھی دیکھا ہے
تم پر کتنا سجتا ہُوں!

اب تو شاذ و نادِر ہی
اپنے آپ میں ہوتا ہُوں

اب تک نبضیں چلتی ہیں
کن حالات میں زندہ ہُوں !

کیسے واپس جاؤں گا
کتنی دُور سے آیا ہُوں !

......

زمیں سے آسماں تک کے سفَر میں
مَقام آتے ہیں کیا کیا رہ گزر میں !

دُرونِ جاں سفر جاری ہے کب سے!
میں اپنا منتظِر ہوں اپنے گھر میں

رہے کیا پھر ہمیں اپنی ضَرورت
اگر آ جائیں ہم اُن کی نظر میں !

ارادے اَور ہمّت کے علاوہ
کوئی شے اَور کیا تھی بال و پَر میں

ہمارے بعد یہ احساس ہوگا
کمی ہے کچھ تمھارے بیشتر میں

......

ہمارے ساتھ جو بیتے سو بیتے
ہمارا نام پڑھ لینا خبر میں

بنایا صبح تو شب توڑ ڈالا
میں رہتا ہُوں یہ کِس دستِ ہُنَر میں!

......

۶۶

گو جہاں ہُوں وہاں نہیں ہُوں مَیں
پھر بھی وہم و گماں نہیں ہُوں مَیں

لاکھ دُھندلا چکے ہیں آئینے
اب بھی خود سے نہاں نہیں ہُوں مَیں

ہے گراں تا گراں رسائی مِری
اُور پھر بے گراں نہیں ہُوں مَیں

مجھ کو لہریں ڈبو کے چھوڑیں گی
ناؤ کے درمیاں نہیں ہُوں مَیں

اِک نظر اِلتفات کی جو ہُوئی
دیکھ لینا میاں، نہیں ہُوں مَیں !

جب سے پیَروں کے نیچے آیا ہُوں
لگتا ہے، آسماں نہیں ہُوں مَیں !

حوصلہ گر خریدنے کا ہو
اس قدر بھی گراں نہیں ہُوں مَیں

ڈھونڈنا ہے مجھے تو دھیان رہے
میں وہاں ہوں جہاں نہیں ہُوں مَیں

دیکھنا ہے کہاں ہُوں مَیں سیفیؔ !
دیکھنا ہے کہاں نہیں ہُوں مَیں

......

عکس بھی مَیں ہُوں، چہرہ بھی مَیں، آئینہ بردار بھی مَیں
دریا کے اِس پار بھی مَیں ہُوں، دریا کے اُس پار بھی مَیں

پہلے اپنے گھر میں دعوت کرتا ہُوں صحراؤں کی
آپ اُٹھا لیتا ہُوں پھر ہر صحرا میں دیوار بھی مَیں

جس دن سارے دریاؤں کو پی جائے گی پیاس مِری
تھوڑی سی کوشش سے کر جاؤں گا دریا پار بھی مَیں

اپنا گاہک بن کر اپنی قیمت آپ لگاتا ہُوں
اور پھر اپنے آپ سے کرتا رہتا ہُوں تکرار بھی مَیں

- جس دن سے اِک اِسم کا سایہ خُون کے اندر اُترا ہے
اپنی ہر تحریک بھی مَیں ہُوں' اپنا ہر مِعیار بھی مَیں

- خُوشبُو کی صُورت میرے رستے میں اب بھی آتی ہے
ایک خوشی ایسی جس پر رویا ہُوں زار و قطار بھی مَیں

اِک دِن مجھ پر خود ہی کُھل جائیں گے سارے دروازے
اِک دِن ہو جاؤں گا دُنیا میں اِتنا بے کار بھی مَیں

......

۵۵

مَیں کہیں، میری ذات اَور کہیں
دِل کہیں، کائِنات اَور کہیں

ہَیں کہیں اَور پیاس کے بیٹے
بہہ رہا ہے فُرات اَور کہیں

آپ لے آئے ہیں مجھے کہیں اَور
بٹ رہی ہے حیات اَور کہیں

منتظِر تھی کئی دنوں سے آنکھ
ہو گئی واردات اَور کہیں

درد کا اُور ہی اِشارہ تھا
رکھ دیا تُو نے ہاتھ اُور کہیں

میں جہاں بھی تھا، تیرے ساتھ ہی تھا
تھا مگر اپنے ساتھ اُور کہیں

پانیوں کے سِوا دِکھائی نہ دیں
آئنے کی صِفات اُور کہیں

اوّلیں شرط یہ سفَر کی ہے
دِن کہیں اُور، رات اُور کہیں

ایک ہی دَر ہے ساری دُنیا میں
بن نہ پائے گی بات اُور کہیں

ہم تو پرچھائیاں ہیں اُن کی منیر!
ہوتے ہیں واقعات اُور کہیں

......

عِشق کی آگ میں جَلا ہی نہیں
جسم کُندن ابھی ہُوا ہی نہیں

رستوں رستوں وُہی تھا ساتھ مِرے
وہ جو ہمراہ میرے تھا ہی نہیں

جس میں لَوٹ آنے کی سہُولت تھی
مَیں نے وُہ راستہ چُنا ہی نہیں

تِتلیاں پَر سمیٹ لیں بھی تو کیا!
مَیں کوئی خواب دیکھتا ہی نہیں

کوئی برگد نہ پیڑ جامن کا
دل مِرا شہر میں لگا ہی نہیں

یُوں ہیں مصروف اپنے آپ میں لوگ
جیسے بستی میں کچھ ہُوا ہی نہیں

چھوڑ کے سَر کو لَوٹ آیا ہُوں
آسماں راہ سے ہٹا ہی نہیں

اپنے اَشعار خود سمجھ لُوں مَیں
میرا اِتنا مَطالِعہ ہی نہیں

آپ کے دام کیا لگیں سیفؔی !
غم کا سِکّہ ابھی چلا ہی نہیں

......

کس منظر میں، کیسے منظر اُگ آتے ہیں!
خواب اُگانا چاہوں، پتھر اُگ آتے ہیں!

یہ ناممکن ہے، پھر بھی لگتا ہے جیسے
قید میں وقت سے پہلے ہی پَر اُگ آتے ہیں

موسم کا اِعجاز ہے یا جادُو ہے کوئی!
راتوں رات درختوں پر گھر اُگ آتے ہیں

پُورے چاند کی رات، سمندر، نرم ہوائیں
سطحِ آب پہ کیا کیا پیکر اُگ آتے ہیں

عِشق میں قامت کا یُوں دھیان رکھا جاتا ہے
گردن کٹ جاتی ہے تو سَر اُگ آتے ہیں

اُس کے نام کا نقّارہ بجتے ہی سیفی !
چاروں جانب درد کے لشکر اُگ آتے ہیں

......

۵۵

پھر دریا سے ناتا جوڑا کرتے ہیں
پہلے خود سے خود کو منہا کرتے ہیں

آئینے کے آگے جو ہے' دھوکا ہے
آئینے کے پیچھے دیکھا کرتے ہیں

ہو سکتا ہے چشمہ بھی ہو پسِ سراب
وقت آنے پر آنکھ کو دریا کرتے ہیں

ہم کیا اُس کی ذات کے اندر جھانکیں گے -
ہم تو اپنے آپ سے پردہ کرتے ہیں

جن کو رنگ اور خُوشبُو کا ہے لمس عزیز
تتلی کے پَر اوڑھ کے سویا کرتے ہیں

لاکھ کھڑے ہوں راہ میں یُوسُف بِکنے کو
سَر میں سَودا ہو تو سَودا کرتے ہیں

اُس سے مِلنا ہو یا اُسے منانا ہو
ایسے جتنے کام ہیں، تنہا کرتے ہیں

وہ جو ایک ہی شب کا مہمان ہوتا ہے
پیڑ اُسی پنچھی کو سوچا کرتے ہیں

اکثر شعروں کے پیراہن میں سیفیؔ !
ہم لفظوں میں نکتے ٹانکا کرتے ہیں

......

۵۵

درد دیکھیں نہ اب دوا دیکھیں
مَرنے والوں کا حوصلہ دیکھیں

کچھ نہیں عِشق میں بعید میاں !
روشنی چھُوئیں اور ہَوا دیکھیں

جب نہ دیکھا اُسے تو کیا دیکھا
دیکھ کر اُس کو اَور کیا دیکھیں

جو نہ دیکھا تھا، وہ بھی دیکھ لیا
اب دِکھاتا ہے کیا خُدا دیکھیں

ہم میں کوئی مشابہت بھی ہے!
آیئے مل کے آئینہ دیکھیں

یہ محبّت تو شے ہی ایسی ہے
آپ بھی اپنا فائدہ دیکھیں

میں پلَٹ جاؤں اپنے گھر کی طرف
آپ بھی اپنا راستہ دیکھیں

کیا کُھلے اُن پہ عشق، جو سیفی
شہر سے دشت کو جُدا دیکھیں!

......

۵۵

.....

خود اپنا ہی تعاقُب کر رہے ہو
خبر بھی ہے، کہاں پہنچے ہُوئے ہو!

نہ ہو جب سامنے تو کیسے لکھُّوں!
لِکھوں کیسے اگر وُہ سامنے ہو

جو سایہ ہو تو پھر ساکِن ہو کیسے
جو ہو دیوار کیونکر ناچتے ہو!

پرندے مجھ کو لے کر اُڑ چکے ہیں
مِری آنکھوں میں اب کیا جھانکتے ہو!

نہ ہو جس کا خطاؤں سے تعلّق
کوئی ایسی سزا میرے لیے ہو!

ہُوئے ہیں کام جب سے ختم سیفیؔ!
بہت مصرُوف تم رہنے لگے ہو

......

۵۵

جب نہ گنبد نہ صدا رقص میں ہو
کیا نہ ہو رقص میں، کیا رقص میں ہو!

عکس ہو اپنی دھمالیں اوڑھے
آئِنہ اپنی جگہ رقص میں ہو

تالیاں پیٹ رہے ہوں پتّے
اور پیڑوں پہ ہَوا رقص میں ہو

ڈوبنے والے ہوں ساحل ساحل
مَوج در مَوج گھڑا رقص میں ہو

رات بھر آیتیں گاتے رہیے !
کیا خبر کوئی دُعا رقص میں ہو

کیا خبر رقص میں ہو قبلۂ جاں
دم بدم سجدہ ادا رقص میں ہو

ایک دَرویش پڑھے جائے غزل
ایک دَرویش سدا رقص میں ہو

رقص میں لمحہ وہ کب آتا ہے
پاؤں ساکِت ہوں، فضا رقص میں ہو

آگ سی شے ہو کوئی رگ رگ میں
ایک اِک اَنگ مِرا رقص میں ہو

سایہ کب ٹوٹ کے یوں ناچتا تھا!
آج ممکن ہے دِیا رقص میں ہو

ٹوٹ بھی جاؤں، پتا بھی نہ چلے
کم سے کم اِتنا نشہ رقص میں ہو!

......

۵۵

پھول تھا مَیں نہ سِتارہ، پھر بھی
مجھ کو ہونا تھا، سو ہوتا پھر بھی

اُڑتی رہتی مِری مٹّی ہر سُو
بڑھتا رہتا مِرا رقبہ پھر بھی

کوہ نے اشک نہ روئے کیا کیا!
لَوٹ کر آئے نہ دریا پھر بھی

چاہے کتنا ہی بچا کر رکھّیں
ٹوٹ کر رہتا ہے شیشہ پھر بھی

کوئی پہچان بنے یا نہ بنے
میں پہن لیتا ہُوں چہرہ پھر بھی

روشنی لاکھ اُسے پہنا دیں
سایہ ہی رہتا ہے سایہ پھر بھی

تُو اگر سامنے آ بھی جاتا
مَیں تجھے دیکھ نہ سکتا پھر بھی

تیرا اِحسان بھی لیتا سَر پر
مجھ کو رہنا ہی تھا تنہا پھر بھی

میں اگر اَور بھی کوشش کرتا
یہی ہونا تھا نتیجہ پھر بھی

لوگ دانا بھی تھے، سچے بھی تھے
میں نے مانا نہیں کہنا پھر بھی

چاہے کِردار بدل بھی جاتے
اُسے کرنا تھا تماشا پھر بھی

درد کی لاکھ قسم کھاؤں منیؔر!
درد دے گا مجھے دھوکا پھر بھی

......

۵۵

نڈر بھی ذات میں اپنی ہُوں، خود سے خائف بھی
لہُو میں میرے حِرا بھی ہے ارضِ طائف بھی

یہی نہیں کہ فرشتہ نہ چھت پہ اُترا کوئی
پہنچ سکے نہ فلک تک مِرے وظائف بھی

پکارتی ہے مجھے تیرے نام سے دُنیا
بدل کے رکھ دیے تُو نے مِرے کوائف بھی

بھرم عزیز تھا تیرا سو تیری جانب سے
خرید لایا ہُوں اپنے لیے تحائف بھی

ہمیں چھُڑا نہ سکے رنگ و بُو سے دامِ خیال
لِکھے تھے اُس لب و رُخسار پر صحائف بھی

کِیا ہے ساتھ ہمارے جو زندگی نے منیؔر
روا رکھے نہ کسی سے کوئی طوائف بھی !

......

۶۶

فصلِ گیسو و رُخسار کیا تھی
جنوں آگے کوئی دیوار کیا تھی

بدن کا ساتھ جب چھوڑا تھا مَیں نے
مری پرواز کی رفتار کیا تھی !

اگر میں سامنے اپنے کھڑا تھا
تو پھر وُہ بیچ میں دیوار کیا تھی

میں اِس جانب سفینے میں رواں تھا
وُہ کشتی دُھند کے اُس پار کیا تھی !

- یہ کن صحراؤں میں در کُھل گئے تھے
مِرے چاروں طرف مہکار کیا تھی

- مِرا سَودا تو کب کا ہو چکا تھا
تو پھر یہ گرمیِ بازار کیا تھی

یہ میرا ذِکر تھا کس سلسلے میں !
یہ میرے نام پر تکرار کیا تھی

نہ تھے جب سَر ہی کاندھوں پر تو سیفیؔ
دِلوں میں خواہشِ دستار کیا تھی !

......

۵۵

جب برسات نکل سکتی تھی
پھر ہر رات نکل سکتی تھی

وقت اِکٹھّے کٹ سکتا تھا
بات سے بات نکل سکتی تھی

اِتنی وِیرانی تو دل سے
ہاتھوں ہاتھ نکل سکتی تھی

ہر شَے دے ڈالی تھی، پھر بھی
کچھ خیرات نکل سکتی تھی

ہر سینے سے تنہائی کی
اِک بارات نکل سکتی تھی

سَر کے کٹنے ہی سے گردن
اِک دو ہاتھ نکل سکتی تھی

لاش اِک اَور بھی میرے گھر سے
میرے ساتھ نکل سکتی تھی

اُس کے سِوا میرے اَندر سے
کس کی ذات نکل سکتی تھی !

......

بڑھاتی رہتی ہے توقیر اُس کی
کبھی عجلت کبھی تاخیر اُس کی

ہے بس آنکھوں تلک میرا علاقہ
اور اس سے آگے ہے جاگیر اُس کی

بچا کر دُھوپ سے رکھنا ہے اُس کو
ہُوئی ہے چھاؤں میں تعمیر اُس کی

– یہ گُل بُوٹے مِرے اندر کہاں تھے!
مِری مٹّی میں ہے تاثیر اُس کی

وُہی بنتے بگڑتے نقش میرے
وُہی پانی ، وہی تحریر اُس کی

– مِری پرواز تھی ہفت آسماں تک
تھی جب تک پاؤں میں زنجیر اُس کی

خطا ایسی بھی مجھ سے کیا ہُوئی ہے!
کوئی دن سے ہے چُپ تصویر اُس کی

بہت مشکل ہے اپنا بُت گِرانا
نہایت سہل ہے تسخیر اُس کی

کوئی دن سے مجھے یُوں لگ رہا ہے
ہو جیسے مضطرب تصویر اُس کی

......

۵۵

ہَوا کے ساتھ رہو' راستہ بنا دے گی
ندی چڑھی تو بڑا مسئلہ بنا دے گی

خود اپنی شکل سے ہونا ہے بے نیاز اُسے
تِری نگاہ جسے آئینہ بنا دے گی

میں ایک پَل جو مشیّت کے سامنے سے ہٹا
وہ مجھ میں مجھ سا کوئی دُوسرا بنا دے گی

مِرے بدَن سے اگر آفتاب اُبھر نہ سکا
دِیے کی دوستی مجھ کو دِیا بنا دے گی

ہمارے خون کی پَرکار، درد کی گردِش
جہاں رُکے گی وہیں دائرہ بنا دے گی

جُنوں، جُنوں ہے، یہ پھر بھی فریب کھائے گا
خرد کا کیا ہے، بہانہ نیا بنا دے گی!

مِٹا سکیں گی نہ مَوجیں بھی پھر اُسے سیفیؔ
جو سطحِ آب پہ چہرہ ہَوا بنا دے گی

......

۵۵

دَرد کو بے نقاب کیا کرتے
خوشبوؤں سے حجاب کیا کرتے

روز پڑھتے تھے اِک نیا چہرہ
آخر اہلِ کتاب کیا کرتے!

عشق سیّد نسَب نہ تھا، ورنہ
صاحبانِ نصاب کیا کرتے!

ہم نہ کرتے اگر یہ کارِ کشید
اُس بدن کے گلاب کیا کرتے

آئینے سے گریز کرنے لگا
اَور اُس کو خراب کیا کرتے

جب وُہ خود ہی سوال بن بیٹھا
پھر اُسے لاجواب کیا کرتے

زندگی ہم نے خود گزاری ہے
اُس کے نام اِنتساب کیا کرتے

جب مجھے ہی طلوع ہونا تھا
رات بھر آفتاب کیا کرتے

ہم کہ صدیوں سے سو رہے تھے منیرؔ
ہم کوئی شرحِ خواب کیا کرتے

ہمارے ساتھ دھوکے ہو چکے تھے
جو ہونا تھے' وہ سَودے ہو چکے تھے

وُہ جھگڑے بھی چُکانا تھے ہمیں ہی
بہت پہلے جو ہم سے' ہو چکے تھے

میں کچھ تاخیر سے مقتل میں پہنچا
مری آنکھوں کے ٹکڑے ہو چکے تھے

مِرے ماتھے پہ کائی جَم چکی تھی
مِرے سجدے پرانے ہو چکے تھے

مجھے ہر بات اُس کی ماننا تھی
مِرے حالات ایسے ہو چکے تھے

صلیبیں بانہیں پھیلائے کھڑی تھیں
جنوں کے خواب پورے ہو چکے تھے

ہُوئے بیدار تو ہم نے یہ جانا
کھرے سِکّے بھی کھوٹے ہو چکے تھے

اَندھیرے میں نظر آنے لگا تھا
تو گویا ہم بھی اَندھے ہو چکے تھے

ابھی شعروں میں کچھ کچھ رَوشنی تھی
اگرچہ لفظ گونگے ہو چکے تھے

......

۵۵

شہر کے آثار پیدا ہو رہے تھے
پھر در و دیوار پیدا ہو رہے تھے

حُسن کو احساس اپنا ہو چلا تھا
آئینے بسیار پیدا ہو رہے تھے

اِنہماک اُس وقت میرا دیکھنا تھا
جب لب و رُخسار پیدا ہو رہے تھے

جاں بچا کر مَیں وہاں سے آ گیا تھا
غم نئے اِس بار پیدا ہو رہے تھے

کچھ کمی بیشی عناصِر میں ہُوئی تھی
رات دن بیمار پیدا ہو رہے تھے

پہلے پیدا مجھ کو کر ڈالا گیا تھا
پھر مِرے مِعمار پیدا ہو رہے تھے

مشکلیں ہر روز بڑھتی جا رہی تھیں
نِت نئے مِعیار پیدا ہو رہے تھے

جس جگہ تنکا نہیں اُگتا تھا سیفیؔ
اب وہاں اَشجار پیدا ہو رہے تھے

......

۵۵

مَیں کتنا خوش تھا، مَیں نے کچھ دِیے اُجال رکھے تھے
دیکھا تو لوگوں نے گھر میں سُورج پال رکھے تھے

وہ دیوار جو سَر پر آن گری تھی، اُس کے پیچھے
اپنے اپنے حصّے کے سب نے بھُونچال رکھے تھے

کتنے تنہا تھے اُس گھر میں رہنے والے جنھوں نے
اپنے اپنے دشت میں اپنے اپنے غزال رکھے تھے!

اِک قطرے کے پیچھے ایک سمندر رقص کناں تھا
اِک لمحے کے پیچھے کیا کیا ماہ و سال رکھے تھے !

پہلے بھی وُہ مَیں ہی سادہ دِل ہوتا تھا ' جس نے
کیا کیا خواب آنکھوں میں کیا کیا دل میں خیال رکھے تھے

میں نے سوتے میں یہ کس کا چہرہ دیکھ لیا تھا
میرے سرہانے میرے ہی سب خدّ و خال رکھے تھے

ایک کو کم ہوتے ' دُوجے کو بڑھتے دیکھ رہا تھا
خوشیاں اِک جانب تھیں اَور اِک سمت ملال رکھے تھے

اپنے بچّوں کے بچّوں میں بانٹ رہا ہُوں سیفؔی !
میں نے اپنے بچپن سے جو نام سنبھال کر رکھے تھے

......

۵۵

دِکھلا کر دریاؤں کی تصویر مجھے
اِک دِن ریت پہ کر دے گا تحریر مجھے

آئینے سے بات چلانے نِکلا ہُوں
خاموشی نے لِکھ دی ہے تقریر مجھے

رات اِک عکس کی قید میں گزرا کرتی ہے
دِن بھر سایہ رکھتا ہے زنجیر مجھے

بات اب شعروں سے آگے جانکلی ہے
خواب سے پہلے مل جائے تعبیر مجھے!

اپنا سودا میں خود بھی کر سکتا ہُوں
لوگ سمجھتے ہیں اپنی جاگیر مجھے

اب میری اِصلاح نہایت مشکل ہے
اب دوبارہ کر ڈالو تعمیر مجھے!

ہر وُہ کام جو مجھ کو اَپنی ذات سے ہو
ہر اُس کام میں ہو جائے تاخیر مجھے

......

۵۵

نفی کے اندر جب اِثبات دِکھائی دے
تب ممکن ہے اُس کی ذات دِکھائی دے

تجھ سا ہو فن کار تو کیسے ممکن ہے
زخم کے پیچھے کوئی ہاتھ دِکھائی دے

مَرنے والا ایک نشے میں ہوتا ہے
مَرنے والے کو کیا گھات دِکھائی دے!

دُور اندیشی ہے یا نقص ہے اِیماں کا !
سُورج سَر پر ہو اوِر رات دِکھائی دے

اب اپنے پیَروں کے نیچے آیا ہُوں
اب مجھ کو اپنی اَوقات دِکھائی دے

اپنے آپ سے جیتیں، بے حد مشکل ہے!
پہلی چال چلیں اوِر مات دِکھائی دے

گردن کانچ کی، ہونٹ اُس کے یاقوتی ہیَں
دِل سے لب تک آتی بات دِکھائی دے

کتنا بے معنیٰ، بے وَقعت لگتا ہَے !
چاند اگر سُورج کے ساتھ دِکھائی دے

ایک ہی خواب نظر آئے دِن بھر سیفیؔ !
ایک ہی چہرہ ساری رات دِکھائی دے

......

۵۵

یہ کیا کہ عدل صاحبِ ثروَت ہی پا سکے
زنجیر ایسی ہو کہ ہَوا بھی ہِلا سکے

یُوں کوڑھ اپنے پاؤں کا آیا نہ تھا نظر
ہم لوگ اپنی ناک سے آگے نہ جا سکے

دریا کو ساری عُمر سمجھتے رہے سَراب
ہم تو فریب بھی نہ سلیقے سے کھا سکے

یہ بھی نہیں کہ دِل میں ہے تصویر اُس کی شکل
یہ بھی نہیں کہ آنکھ ہی جلوہ دِکھا سکے

یہ بھی تو اِک طرح سے تھا بالواسطہ حجاب
اپنی نگاہ کا بھی نہ احساں اُٹھا سکے

صَحرا تو جا ہی سکتا ہے دریا تلک منیرؔ!
صَحرا تلک مگر کوئی دریا نہ آ سکے

......

۵۵

خواہش کو مہمان کرو گے
اپنا ہی نقصان کرو گے

ساری بستی مرنا چاہے
کس کس پر احسان کرو گے!

اب کس کی باری ہے صاحب!
اب کس کو حیران کرو گے؟

کب تک اَور پرکھنا ہم کو
کب تک اِطمینان کرو گے

میں تو مٹّی ہو جاؤں گا
تم کیا میری جان کرو گے؟

جو بھی کام کرو گے سیفیؔ !
خارِج از اِمکان کرو گے

......

۵۵

ایسی مشکل میں نہ جاں تھی پہلے
زیست کب اِتنی گراں تھی پہلے

آسماں تھا نہ زمیں تھی کوئی
کائنات ایک دُھواں تھی پہلے

دُھوپ بہروپ پگھلتا سونا
چاندنی آبِ رواں تھی پہلے

ایک مخصوص سماعت سب کی
ایک مانوس زباں تھی پہلے

قتل کے کب تھے یہ سارے ساماں!
ایک تیر، ایک کماں تھی پہلے

یہ جو بجلی سی چمک جاتی ہے
سات پردوں میں نہاں تھی پہلے

اِس جگہ بنک نہیں ہوتا تھا
اِک کتابوں کی دُکاں تھی پہلے

کچھ تو رَستے تھے سِتاروں ایسے
کچھ طبیعَت بھی رواں تھی پہلے

پُھول ہی پُھول کِھلا کرتے تھے
مجھ میں یہ آگ کہاں تھی پہلے!

زخمِ دیوار بتاتا ہے منیر!
ایک تصویر یہاں تھی پہلے

......

۵۵

پس منظر میں منظر سمٹا ہو سکتا ہے
عکس کے اندر بھی آئینہ ہو سکتا ہے

سُورج ہو سکتا ہے سُورج کے آگے بھی
سُورج کے پیچھے بھی سایہ ہو سکتا ہے

سُنی سُنائی باتیں جھُوٹ بھی ہو سکتی ہیں
پیڑ پرندوں سے بھی لپٹا ہو سکتا ہے

آنکھیں یُوں ہی خواب سَراب کہاں بنتی ہَیں
دشت کے آنگن ہی میں شیشہ ہو سکتا ہَے

ذات ہَے کوئی اَور ہی شے پہچان سے ہَٹ کر
قطرہ دریا میں بھی تنہا ہو سکتا ہَے

دیکھنا پڑتا وُہ بھی، جس سے بچنا چاہے
تُو آنکھیں ہونے سے اَندھا ہو سکتا ہَے

یہ جو عشق کا کھیل رچا بیٹھے ہیں ہم تم
سوچو تو اِس کھیل میں کیا کیا ہو سکتا ہَے!

اپنا ایک طِلسم ہے خاموشی کا سیفیؔ!
چُپ رہنے سے اَور بھی چرچا ہو سکتا ہَے

......

۶۶

جب حُسنِ معیار نظر میں ہوتا ہے
پھر سودوں کا سودا سَر میں ہوتا ہے

ہر آہٹ ہوتی ہے دِل کی دھڑکن میں
ہر دروازہ آنکھ کے دَر میں ہوتا ہے

مَیں نقطوں کی اوٹ سے اُس کو تکتا ہُوں
وُہ تصویروں کے پیکر میں ہوتا ہے

پہلے دروازے تک آیا کرتا تھا
اب وہ میرے ساتھ سفر میں ہوتا ہے

دِن بھر کی تنہائی پاگل کر دے گی
دِن بھر چاند اکیلا گھر میں ہوتا ہے

ساری خوشیاں ایک سی، غم اِک جیسے ہیں
ایک ہی منظر، ہر منظر میں ہوتا ہے

اِک سے زیادہ بھی ہوں، ممکن ہے لیکن
اِک چہرہ تو ہر پتھر میں ہوتا ہے

.....

پہلے خود ہی پردوں کو سَرکا دیتا ہے
پھر وُہ میری آنکھوں کو پتھرا دیتا ہے

پانی کی آغوش سے مٹّی کھینچ نکالے
پھر اُس مٹّی پر دریا دَوڑا دیتا ہے

کون ہے جو اُلجھا دیتا ہے پکّی ڈوریں
کون ہے جو کچّے دھاگے سُلجھا دیتا ہے

کون عطا کرتا ہے آنکھیں اِن لفظوں کو
کون مِری تحریروں کو مہکا دیتا ہے

مٹّی مجھ کو شکل بدلنے سے کیا روکے !
جب آئینہ روز نیا چہرہ دیتا ہے

روتے رہنے ہی سے کام بنے گا سیفیؔ !
پانی تو پتھر کو ریت بنا دیتا ہے

......

۵۵

ہمارے درمیاں رکّھا ہُوا ہے
یہ کیسے آسماں رکّھا ہُوا ہے

دکھائی کیوں نہیں دیتا میں خود کو
مجھے آخر کہاں رکّھا ہُوا ہے

......

سفینے حسرتوں سے تک رہے ہیں
کِناروں کو رواں رکّھا ہُوا ہے

یہی تعبیر ہے کیا روشنی کی !
چراغوں میں دُھواں رکھا ہُوا ہے

یہی کیا کم ہے میرے آنسوؤں پر
حصارِ کہکشاں رکھّا ہُوا ہے

میں ورنہ کب کا مٹّی ہو چکا تھا
مجھے غم نے جواں رکھّا ہُوا ہے

جلا کر اِک دِیا آنکھوں میں اب بھی
بنامِ مہ وَشاں رکھّا ہُوا ہے

کوئی گاہک نہیں ہے پھر بھی سیفی !
مجھے اُس نے گَراں رکھّا ہُوا ہے

......

رنگ و بُو، عِلّت و سبب کیا ہے !
کچھ نہیں ہے تو پھر یہ سب کیا ہے !

اُس کا ہونا ہے ناگُزیر تو پھر
کیوں ہے، کیسے ہے اَور کب کیا ہے !

عِشق کے سلسلے سے بیعَت ہُوں
نام کیا چیز ہے، نسَب کیا ہے !

غم اگر ہے مِرے نہ ہونے کا
مسکراہٹ سی زیرِ لب کیا ہے!

اب تو مَیں جا چکا ہوں اپنی طرف
اب جو آپ آئے ہیں تو اَب کیا ہے!

یہ جو اَشعار لِکھ رہے ہو منیر
یہ ادب ہے تو پھر ادب کیا ہے!

......

یہ جو صحرا سا کوئی حلقۂ گرداب میں ہے
پارۂ ابر ہے اور قُلزُمِ بے آب میں ہے

اِک بگولا سا اُڑائے لیے پھرتا ہے مجھے
رقص یہ کیسا بپا دشتِ تہہِ آب میں ہے!

اب بھلا آنکھ جھپکنے کی ہو فرصت کیسے!
اب تو اِک خواب مِرے دیدۂ بے خواب میں ہے

جتنی جلدی ہو میاں، اِس سے کنارہ کر لو!
یہ مِری آنکھ ہے اور عرصۂ سیلاب میں ہے

تُو بھی جینے کے بڑے ڈھنگ سکھاتا تھا مجھے
نام تیرا بھی مِری مَوت کے اَسباب میں ہے

حُسن بھی حُسن ہے، جب تک ہے تحیّر آسا
عِشق بھی عشق ہے، جب تک حدِ آداب میں ہے

آسماں میری بھی منزل ہے مگر رستے میں
کام کچھ دیر ابھی وادیِ مہتاب میں ہے

اِس شب و رُوز کی ظُلمت میں بُھلا بیٹھا تھا
ایک تصویر ابھی دیدۂ خوں ناب میں ہے

اِس لیے سب کو گلے ہنس کے لگاتا ہُوں منیؔر!
صفِ اَعدا سے جو باہر ہے وہ اَحباب میں ہے

......

۵۵

ہر گنبدِ بے در میں بھی اِک در ہے کہ تُو ہے
پھر مجھ میں کوئی اَور نوا گر ہے کہ تُو ہے

اِک اَور ہی عالَم ہے وَرائے خس و خاشاک
اِک اَور ہی منظر پسِ منظر ہے کہ تُو ہے

تاحدِّ نظر ایک ندی ہے، کہ ہُوں میں بھی
تاحدِّ خیال ایک سمندر ہے کہ تُو ہے

- پیوست ہیں مٹّی میں مِرے پاؤں کہ میں ہُوں
اَفلاک کے سینے پہ مِرا سَر ہے کہ تُو ہے

وحشت اِسے کہیے نہ تحیُّر اِسے کہیے !
میں بھُول چلا تھا، مجھے اَزبر ہے کہ تُو ہے

- دیکھُوں تو تِرا ہونا، سہارا بھی ہے مجھ کو
سوچُوں تو مجھے ایک یہی ڈر ہے کہ تُو ہے

......

۵۵

آبلہ ہے کہ گھاؤ، جو بھی ہے
سامنے میرے لاؤ، جو بھی ہے!

چاک سے اب مجھے اُتارو بھی
میری صُورت دِکھاؤ، جو بھی ہے!

جو نہیں اُس کی کیا پریشانی
خیر اُس کی مناؤ، جو بھی ہے!

رکھ دیا ہے تمھارے چکنے کو
درد کی فاختاؤ' جو بھی ہے!

ہم ترے در سے اب نہ اُٹھیں گے
تیرا ہم سے سُبھاؤ' جو بھی ہے!

دوست تو اپنے آپ بنتے ہیں
کوئی دُشمن بناؤ' جو بھی ہے!

پا گئے ہیں تمھارا بھید سبھی
اپنا بھاؤ گراؤ' جو بھی ہے!

عِشق کی بد دُعا لگی ہے تمھیں
بیٹھے دُنیا کماؤ' جو بھی ہے!

منتظِر ہیں سماعتیں سب کی
اپنی اپنی سُناؤ' جو بھی ہے!

یہ نشانی ہے اِک پیمبر کی
یہ شکستہ سی ناؤ ، جو بھی ہے !

جرُعہ جرُعہ مَیں پی رہا ہُوں منیؔر
میرے دِل میں الاؤ، جو بھی ہے!

......

۵۵

ایک نشہ سا طاری ہے
درد کی دستک جاری ہے

آگ میں بھی پیڑ اُگتے ہیں
برف میں بھی چِنگاری ہے

ایک سفر ناکام ہُوا
دُوجے کی تیّاری ہے

میں چالیس چل بیٹھا ہُوں
اب مٹّی کی باری ہے

آگے ہے سب آسانی
مَرنے تک دُشواری ہے

اُس سے خواب بھی مانگا کر!
جس نے نیند اُتاری ہے

تم سے رات نہیں کٹتی
میں نے عُمر گزاری ہے

یہ جو میں رو دیتا ہُوں
کس کی ذِمّے داری ہے!

خالی ہے ہر کاسۂ سَر
شہر کا شہر بھکاری ہے

ڈھونڈنا پڑتا ہے خُود کو
بس اِتنی دُشواری ہے

حُسن بھی دھوکا آنکھوں کا
عِشق بھی دُنیا داری ہے

وقت، مسلسل وَجد میں ہے
رقص برابر جاری ہے

......

٥٥

کوئی سُورج نہ دِیا یاد آئے
وہ اندھیرا ہے، خدا یاد آئے !

کیا تعجّب ہے جو اِس عالَم میں
ہر گھڑی کوئی دُعا یاد آئے !

تم تو کہتے تھے نہ یاد آؤ گے
تم تو پہلے سے سِوا یاد آئے

گردشیں تیز ہوں تسبیحوں کی
جب کوئی بندِ قبا یاد آئے

کیا نظر آئے جب آنکھیں نم ہوں!
درد بھُولے تو دوا یاد آئے

دشت میں ہو مجھے پانی کی طلب
اور تہہِ آب' ہَوا یاد آئے

کہہ نہیں سکتے یقیں سے سیفیؔ
اُن کی یاد آئے تو کیا یاد آئے!

......

۵۵

ایسی بھی صورتِ حالات نہ سمجھی جائے
میری پسپائی مِری مات نہ سمجھی جائے

یہ تو رستے مجھے لے آئے ہیں تیری جانب
یہ ملاقات، ملاقات نہ سمجھی جائے

بعض اَوقات میں نشّے میں نہیں بھی ہوتا
میری ہر بات، مِری بات نہ سمجھی جائے

اب تو صحرا بھی مِرے ساتھ سفر کرتے ہیں
صرف وحشت ہی مِرے ساتھ نہ سمجھی جائے

فیصلے سارے کہیں اَور ہُوا کرتے ہیں
میری رُسوائی مِرے ہاتھ نہ سمجھی جائے

وقت آنے پہ گلا اپنا دبا سکتا ہُوں
اِتنی کم زور مِری ذات نہ سمجھی جائے

......

نیند کب آئی تھی، درِ خوابوں کے وا کیسے ہُوئے
ہم شبِ ہجراں کے ساتھی، ہم جُدا کیسے ہُوئے

اوڑھ لی تم نے مِری صُورت، تمھیں یہ کیا ہُوا
تم تو میرا عکس تھے، تم آئِنہ کیسے ہُوئے

تم تو مجبوراً تھے پردے میں، مجھے حیرت ہے یہ
لوگ تم جیسے بھلا مجھ سے قضا کیسے ہُوئے

یہ تمھاری بے نیازی کا نتیجہ ہی نہ ہو !
دِل اگر دِل ہیں تو پھر بے مدّعا کیسے ہُوئے

دیکھنا یہ ہے مِرے سینے کی وُسعت کیا ہُوئی
سوچنا یہ ہے تمھارے غم خطا کیسے ہُوئے !

جو نہ کرنا تھا بھروسا ' تم پہ وُہ بھی کر لیا
اب خیال آیا کہ ہم بے دست و پا کیسے ہُوئے

دیکھنے سے اُس کو کیسے مل گئی فرصت منیر !
سامنے وہ تھا تو پھر سجدے ادا کیسے ہُوئے

......

٥٥

کب تک اَب اور زحمتِ منظر اُٹھایئے !
دیوار میرے قد کے برابر اُٹھایئے !

پیروں کی بیڑیاں ہیں جزیروں کی چاہتیں
ساحل کہیں ڈبو نہ دے، لنگر اُٹھایئے !

جائے تو بھول جایئے، جیسے کبھی نہ تھا
آئے تو آنے والے کو سر پر اُٹھایئے !

میری خطا پہ سنگ زنی کیجیے، مگر
اپنے گناہ تول کے پتھر اُٹھایئے !

احسان آسماں کا بہت دِن اُٹھا لیا
اَب خاک سے بھی کوئی پیمبر اُٹھایئے !

......

لبوں پر ثبت جس دم مُہرِ استبداد ہوتی ہے
مِرے سینے میں برپا محفلِ مِیلاد ہوتی ہے

ایک آیت سو رہی تھی اُس کے بستر پر منیر
اور جاری تھا مدینے کو سفر قرآن کا

ہاتھ کی رِحل پہ جب تک نہ ہو اُس کی صُورت
ایک آیت کی بھی تفہیم نہیں ہو سکتی

الِف سے میم کا درپیش ہے سفر ہم کو
لِیا ہے مکتبِ طیبہ میں داخِلہ ہم نے

ایک ہی شخص تھا دُنیا میں الگ بے سایہ
رَوشنی اَب کبھی تجسیم نہیں ہو سکتی

اُٹھانا بوجھ کوئی کم نہیں تھا قرآں کا
نہ تھی زمین میں طاقت نہ آسمان میں جان

کبھی جو دیر سے لوٹوں تو میری ماں کی طرح
وُہ میرے رِزق کا حِصّہ نکال رکھتا ہے

آواز دے کے خود کو بلانا پڑا مجھے
اَپنی مدد کو آپ ہی آنا پڑا مجھے

میرے سایے سے چھڑا دے مِرا پیچھا اَب تو
رَوشنی، تیری طرف کب سے سفر میرا ہے!

میں کہاں ہُوں مجھے پتا تو چلے
میری آنکھوں سے کائنات گزار!

کِتنا ترسا ہوں میں اِس اَنجمن آرائی کو
وَصل کے مول نہ بیچوں کبھی تنہائی کو

پانی قبول ہی نہیں کرتا تھا میری لاش
دریا کو اَپنا نام بتانا پڑا مجھے!

جائز ہے اُس کا قتل ہمارے حساب سے
جِس نے محبّتوں کو نکالا نِصاب سے

اب تو ہر چوکھٹ پر ماتھا ٹیک رہے ہو سیفی!
اَور اگر دیواریں نِکلیں دروازوں کے پیچھے

کاغذی پیرہن
KAGHADHI PAERAHEN
ISBN 969-8527-52-4